جلد02شمارہ۱۸، ۲۰۲۴

Article

"Raja gidh". Philosophy in the Context of Halal and Haram: A Special Study

”راجہ گدھ“۔ فلسفہ حلال وحرام کے تناظر میں: خصوصی مطالعہ

Mohsin Khalid Mohsin[*1], **Imama Riasat**[2]
[1]Lecturer, Govt. Shah Hussain Graduate College, Lahore
[2] School Education Department, Attock
*Correspondence: mohsinkhalid53@gmail.com

محسن خالد محسن،[1] امامہ ریاست
[۱]لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ شاہ حسین گریجوایٹ کالج، لاہور [۲]سکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، اٹک

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:15-07-2024
Accepted:12-09-2024
Online: 27-9-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: This paper covers the symbolic, character, social, and religious interpretations of Banu Qudsia novel Raja Gidh. Its popularity can be estimated from the fact that 32 editions have been published since 1981. This novel deals with character, psychological, symbolic, social, and moral themes, including madness, mental chaos, despair, loneliness, indifference, negative and positive experiences, sacrifice, respect for humanity, halal sustenance, self-defeat, moral decay, human and mental and intellectual evolution, psychology of the individual, integration of religion and civilization, the existence of Sufism and spirituality, and all such diverse topics are covered.

Key words: Urdu novel, Halal and Haram philosophy, madness, Freud, psychology, Partition of India, religious concepts, Islamic beliefs, Sufism, spirituality, human emotions, Western civilization, education system, sexual lust.

عہد حاضر میں رزق حرام کو پورے معاشرے میں جس طرح سے تقویت اور فروغ حاصل ہو رہا ہے اس سے انسان نہ صرف حصول زر کی ہوس کا نشانہ بن رہا ہے بلکہ وہ تمام پابندیوں کو خواہ وہ مذہبی، اخلاقی اور روحانی قدریں ہی کیوں نہ ہوں بالائے طاق رکھ کر حریت پسندی سے زندگی جینا چاہ رہا ہے۔

بانو قدسیہ اس بے راہ روی کا ذمہ دار مغرب کے آزادانہ طرز رہائش کو قرار دیتی ہیں جس کی تقلید کرنے کی شدت اہل مشرق کے یہاں تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی ناآسودگیوں کا شکار ہو کر دیوالیہ اور دیوانگی کی بھول بھولیوں میں گم ہو رہا ہے۔

جب انسان اپنی معاشرتی زندگی میں بہت زیادہ ترقی حاصل کرتا ہوا بلند مقام کی اس منزل تک پہنچ جاتا ہے کہ جس کے بعد آگے بڑھنے کی کوئی امکانی صورت نظر نہیں آتی تو وہ دیوانگی کی طرف مائل ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن اگر انسان اپنی صلاحیتوں کو اپنی ترقی کے ساتھ ساتھ دیگر انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی استعمال کرے تو وہ اس قسم کے ذہنی ہیجان اور مایوسی سے بچ سکتا ہے۔ خوشگوار زندگی کا یہی نقطہ نظر مصنفہ نے اپنے اس ناول "راجہ گدھ" میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول میں قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے مختلف معاشرتی اور نفسیاتی مسائل کے علاوہ نئے دولت مند اور سرمایہ دار طبقے کی حرص پسندی اور ہوس دولت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس ناول کی کہانی سرزمین پاکستان سے ابھرتی ہے جہاں آزادی اور تقسیم وطن کے بعد نوجوان نئی نسل سامنے آتی ہے جو مختلف ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ روحانی اضطراب کی کیفیات سے دوچار ہے۔ تقسیم کے المیے سے پاکستان ایک علیٰحدہ ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا، نئے معاشرے کا وجود عمل میں آیا اور دھیرے دھیرے جاگیرداروں اور نوابوں کی جگہ سرمایہ دار طبقے حاوی ہوتے چلے گئے۔ مادی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل ہونے سے مادیت کو بڑھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ حساس دل و دماغ رکھنے والے انسانوں کے اندر بیزاری، کشمکش اور اضطرابی کیفیات ظاہر ہونے لگیں اور پاکستانی معاشرے کی اسی صورتحال کی بہترین عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔

اس ناول کے مسائل اتنے وسیع ہیں کہ یہ صرف پاکستانی معاشرتی مسائل کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ پورے برصغیر میں بسنے والے انسانوں کو یہ اپنے مسائل محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ناول اپنے عنوان کے اعتبار سے دو الفاظ یعنی راجہ اور گدھ کا مرکب ہے جس میں راجہ بادشاہ اور گدھ مردار پرندے کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں گدھ کو علامتی طور پر لیا ہے کہ گدھ مردار اجسام کو کھاتا ہے اس لیے گدھ کی علامت تشبیہ کے طور پر ان لوگوں کے لیے استعمال کی گئی ہے جو حرام و حلال میں تمیز نہیں کرتے اور اسی وجہ سے وہ زیادہ تر ذہنی و نفسیاتی انتشار کا شکار رہتے ہیں۔

راجہ گدھ کو اس عہد کے ناولوں میں ایک اہم ناول اس لیے مانا جاتا ہے کہ آج کا زمانہ شعوری اور سائنسی اعتبار سے کافی ترقی کر چکا ہے لہذا ایسے زمانہ میں اس طرح کے ادبی فن پارے ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس ناول میں مختلف فلسفوں اور نظریات کو بیان کیا گیا ہے اور انسانوں و جانوروں کے حوالے سے زبردست گتھیاں سلجھانے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ انسان کی ابتدائی حیات، باطن

کے مشاہدات اور مابین خیالات کے حوالے سے زندگی اور حاصل زندگی کی بہترین تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ ناول کا آغاز سوشیالوجی کی کلاس کے ابتدائی تعارف سے ہوتا ہے جہاں دیگر طالب علموں کے ساتھ ساتھ اس کلاس کا پروفیسر بھی انتہائی عجیب و غریب انداز میں اپنا تعارف کرواتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "اٹ از می۔ ڈاکٹر سہیل۔ میں آپ کو سوشیالوجی پڑھاؤں گا۔ بلیک بورڈ پر تصویر بنانے والا پروفیسر ہم سے بمشکل پانچ چھ سال بڑا تھا لیکن کہیں اس کے پاس ایک ایسا ہنٹر موجود تھا جو شیروں کو سدھارنے والے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ذہنوں کا جوڈو کھیلنا جانتا تھا۔ نظریات کی کشتی کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے شاگردوں کی کھوپڑیاں کھولنا اور خالی پا کر انہیں جوں کی توں بند کر دینا اسے جی سے پسند تھا۔"(۱)

مصنفہ نے ناول کے کرداروں کے ذریعے سے اپنے خیالات و نظریات کو بیان کیا ہے اور یوں ناول میں بیان کردہ مختلف کہانیوں کو ایک منظم انداز میں ترتیب دیا جس میں انسانی قول و فعل پر بڑی عمدگی سے بحث کی گئی۔ ناول کے ابتدائی تقریباً ۲۳ صفحات میں سیمی، آفتاب اور قیوم کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے اور پھر باقی کے صفحات قیوم کی بیماری اور ذہنی دیوانگی کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تینوں کرداروں کو مرکزی کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا۔ سیمی شاہ اور آفتاب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جب کہ قیوم اور یونی ورسٹی کا پروفیسر سہیل بھی سیمی شاہ کی محبت میں گرفتار ہیں لیکن وہ کبھی بھی اس کی محبت کو نہ پا سکے مگر دوسری طرف سیمی شاہ کا عشق جو اسے آفتاب سے تھا وہ بھی لاحاصل ہی رہا کہ جس نے بالآخر اسے خودکشی جیسے حرام فعل پر مجبور کر دیا۔ سیمی، آفتاب، قیوم اور پروفیسر سہیل کے کرداروں کے ذریعے عشق لاحاصل اور رزق حرام سے انسانوں میں جنم لینے والی دیوانگی اور اس سے معاشرے میں پڑنے والی دراڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حرام و حلال اور اخلاقی زوال کے تصور کے ساتھ ساتھ مادیت کے اس جدید دور میں ناول کا ہر کردار مایوسی، ناامیدی اور تنہائی کا بھی شکار نظر آتا ہے جس کی پہلی مثال تو سیمی ہے کہ جس کو آفتاب شاہ کی بے ضمیری، بے حسی اور بے وفائی نے اکیلے پن اور مایوسی کا شکار بنا دیا ایسے جذبات جب افراد معاشرہ میں پیدا ہوتے ہیں تو بغاوت جنم لیتی ہے۔ معاشرے میں چاروں اور جب گمراہی اور طوائف الملوکی بڑھتی ہے تو کوئی بھی فرد اطمینان و سکون حاصل نہیں کر پاتا اور یوں دیوانہ پن رواج پاتا ہے۔

ناول ''راجہ گدھ'' میں خودکشی اور پاگل پن سے متعلق سوشیالوجی کی کلاس میں ہونیوالی گفتگو ملاخط فرمایئے:

> "پروفیسر سہیل بڑی ہنرمندی سے معاشرت اور فرد کی باہمی بحث پر بات کرتا ہے اور سیمی شاہ بول اُٹھی کہ سر آپ کا کیا خیال ہے کہ معاشرہ آئیڈیل ہو تو پھر بھی کوئی شخص خودکشی کر سکتا ہے۔ پروفیسر نے کہا: خودکشی ایک علامت ہے کہ میم عاشرے کے اندر کے درجہ

حرارت کو چیک کرنے کے لیے۔ افسوس مس شاہ ابھی آدرشی سوسائٹی کا وہ معیار نہیں کہ ہم کوئی تجربہ کر سکتے ہیں کہ اس پاگل پن کی وجہ کیا ہے۔"(۲)

ناول راجہ گدھ بانو قدسیہ کی تمام تر تخلیقات میں ایک بنیادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہی تاثر ابھرتا ہے کہ شاید یہ اخلاقیات پر مشتمل ایک کتاب ہے اسی بنا پر اسے معاشرتی وفکری سطح پر کافی اعتراضات کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن ان اعتراضات سے قطع نظر اس کا لب لباب اور مقصد تخلیق رزق حلال کی اہمیت وافادیت سے آگاہی، رزق حرام سے نفرت اور اس کے نقصانات کا سبق ہے۔

مصنفہ نے اپنے بہت سے انٹرویوز، اپنی تحریروں اور سب سے بڑھ کر اس ناول میں بھی اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ہمارا معاشرہ کہ جس پر مغرب اپنا رنگ بہت اچھی طرح جما چکی ہے اگر ان اثرات سے نکل کر اسلامی روایات اور اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے رزق حلال کو اپنائے تو اس وجہ سے اس کی معاشرتی زندگی میں پائے جانے والی تمام تر برائیاں اور خرابیاں اختتام پذیر ہو سکتی ہیں۔ اس ناول میں رزق حرام کی بہت سی اقسام بیان کی گئی ہیں جن میں ڈوب اور دھنس کر انسان بے چینی و پاگل پن کی آخری حدود کو جا پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ جرائم اور خودکشی جیسے مکروہ فعل کے پس پردہ بھی رزق حرام کو ہی قصوروار ٹھہرایا گیا ہے۔ زنا بھی رزق حرام ہی کی پیداوار ہے جس کی وجہ سے انسان مایوسی اور ناکامی کی دلدل میں دھنسا چلا جاتا ہے۔

اس ناول کے ابتدائی صفحات میں مصنفہ رزق حلال کے اسلامی نقطہ نظر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفہ بالخصوص فرائیڈین فکر کی بیخ کنی کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہیں اور اس حوالے سے مصنفہ نے ناول کے کرداروں کے توسط سے عملی طور پر فرائیڈ کے نظریات کے نقصانات و نتائج بیان کیے۔ اس ناول میں بحث کا آغاز ہی فرد اور معاشرے کے تعلقات سے ہوتے ہوئے فرد کی آزادی اور معاشرے کی ذمہ داریوں کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ کلاس میں موجود پروفیسر سہیل معاشرہ اور فرد کی آزادی سے متعلق طلبا سے مختلف سوالات کرتے ہوئے بالآخر بحث کا رخ خودکشی اور پاگل پن کی طرف موڑتا ہے۔ اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے اقتصادی، معاشرتی، شخصی، ذاتی اور جبلی وجوہات کے حوالے دیئے گئے۔ پروفیسر کے خیالات جو اس ناول کا بنیادی نقطہ نظر بھی ہیں کے خیال میں خودکشی کی وجہ پاگل پن ہے۔ دوران بحث ناول "راجہ گدھ" کا ایک کردار آفتاب فرائیڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"پاگل پن پیدا ہونے کی وجہ تشنہ خواہشوں سے آرزوؤں کا پیدا ہونا ہے جس کا نہ سر ہوتا ہے اور نہ پیر کہ یہ ٹیبوس سے جنم لیتی ہیں جو کلچر کا حصہ ہوتی ہیں جس سے ماموں زاد بہن یعنی کزن سے نہیں ہو سکتی جبکہ اُس سے عشق لاحاصل کی توقع کی جاتی ہے۔ فرائیڈ نے ایسا ٹھیک ہی کہا ہے۔ سیمی نے قینچی جیسی زبان میں انگریزی کے تیکھے الفاظ دُہرائے۔(۳)

بانو قدسیہ اور فرائیڈ کے نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مصنفہ روحانیت سے پر ہیں لیکن فرائیڈ کے ہاں روحانیت کی کوئی جگہ نہیں یہی وجہ ہے کہ ناول کی شروعات میں طلبا و ٹیچر کی گفتگو کے دوران بہت سے حصوں میں فرائیڈ کا نام اور اس کے نظریات کے بیان

کے ساتھ ساتھ اس کی خامیاں بھی بتائی گئیں ہیں۔خودکشی اور پاگل پن سے متعلقہ حاصل بحث دونقطہ نظر سے ہمارے سامنے آتی ہے یعنی ایک نقطہ نظر فرائیڈین اثرات کا حامل ہے جو سیمی شاہ کی خودکشی کے تناظر میں بھی نظر آتا ہے جب کہ دوسرا پروفیسر سہیل کا نقطہ نظر ہے جو مثبت و منفی دونوں صورتوں پر مشتمل اور فرائیڈ کے نظریات کے برخلاف ہے۔

اس ناول میں سیمی شاہ کے کردار کے ذریعے ایک ایسے زوال پذیر پاکستانی معاشرے کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جس کی جذباتی زندگی مادیت پرستی کی نظر ہوئی اور ایسے گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچے عجیب وغریب ذہنی ونفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سیمی شاہ بھی ایسے ہی گھرانے کی پیداوار ہے جسے اپنے معاشرے اور والدین دونوں ہی سے گلے شکوے تھے کیوں کہ اس کے والدین مادہ پرست معاشرے کے نمائندہ ہیں جن کو معاشرے میں اپنی عزت ووقار، مرتبے اور کاروبار کی فکر تو ہے لیکن اپنے باطن سے پیدا کی ہوئی اولاد کو انھوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ سیمی کا باپ اسے روپیہ، پیسہ اور بنیادی ضروریات تو دے سکتا تھا لیکن اپنا قیمتی وقت اور توجہ نہیں۔ دوسری طرف اس کی ماں کا بھی یہی حال تھا حالانکہ سیمی ایک ایسی ماں کی متلاشی تھی جو اسے اپنی ممتا کی آغوش میں پناہ دیتے ہوئے اس کے سارے دکھ درد اپنے دامن میں سمیٹ لے۔

والدین کے غیر روایتی کردار و رویے نے سیمی کی شخصیت کو متاثر کرتے ہوئے اس کے اندر احساس محرومی کی جنم دیا۔ اسی وجہ سے اس نے ساری زندگی ہاسٹلوں اور ہوٹلوں کے دھکے کھاتے گزاری اور پھر رہی سہی کسر آفتاب کے عشق لاحاصل نے پوری کی اور یوں مایوسی وبیزاری کے ساتھ ساتھ محبت و ناآسودگی اسے ہر وقت مضطرب رکھتی جس کا انجام خودکشی ٹھہرا۔ سیمی شاہ کے جو مسائل ہیں وہ ہمارے معاشرے کی بیشتر اس نوجوان نسل کو درپیش ہیں جو ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ ناول ''راجہ گدھ''میں سیمی قیوم کے ساتھ دوران گفتگو اپنے اونچے بیوروکریٹ طبقے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اپنے والدین کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتی ہے:

> "میرے ساتھ میرے گھر کے بارے میں بات نہ کرو کہ کہ ساری مصیبت اُنھی کی وجہ سے ہے ۔ جاہل آدمی پاکستان کا ونچا بیوروکریٹ یہ تھوڑی خیال کرتا ہے کہ اس کے بیٹھی کے کچھ مسائل ہیں وہ تو اپنی سوچوں میں گم رہتا ہے اس کے پاس وقت ہی نہیں کہ اس کے دماغ میں آفس کی فائیلیں اور اپنی ساکھ بنانے کی دھن سوار ہوتی ہے۔۔۔بے وقوف آدمی اس مصیبت میں مسرت کی تلاش کیسے کریں کہوہ بیٹی کے پاس بھاگا بھاگا تھوڑا آئے گا۔ تمہارا جی نہیں چاہتا ماما سے ملنے کو، چاہتا ہے، سیمی دکھ سے ہنسنے لگی لیکن جس ماں کو میں ملنا چاہتی ہوں وہ کہیں موجود نہیں ہے۔ میں گلبرگ کی ایک سجی سجائی کوٹھی میں کسی بوڑھی خوفزدہ بھتنی سے ملنے نہیں جاسکتی۔"(۴)

ہمارے معاشرے کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس میں جو بھی کمیاں، کوتائیاں اور کمزرویاں پائی جاتی ہیں انھیں دیکھتا تو ہر فرد معاشرہ ہے لیکن انھیں ختم کرنے کی جرات ولب کشائی کوئی نہیں کر سکتا اور اسی بنا پر انسانیت کہیں دور پاتال میں جاگری ہے کیوں کہ ہم

اپنی نادانیوں کو مصلحتوں کا نام دیتے ہوئے غلطی پر غلطی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر موجودہ عہد کے اساتذہ کے حوالے ہی سے بات کی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں خود استاد ہی نے اپنا معیار گرا دیا ہے اور اپنی عزت و وقار کو جھوٹی اور عام شہرت کے لیے مجروح کر دیا ہے۔

یہ تمام باتیں ہمیں دوران امتحان نقل کروانے پھر پرچوں کی پڑتال کرنے وغیرہ میں عام نظر آتی ہیں۔ اگر سچ پوچھیں تو آجکل عزت و مرتبہ تو حاصل ہی دو نمبری کام کرنے والوں کو ہے۔ اگر کہیں کوئی سچ و حق کی بات کرنے والا اپنی بات کہہ دے تو سمجھو کے اس نے تو خود اپنے سر مصیبت ڈال لی ہے۔ چنانچہ بحیثیت راقم مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ جہاں معاشرے کی بنیادیں رکھنے والے ہی غلط ہیں تو وہاں کسی اچھائی کی امید کیسے رکھی جا سکتی ہے۔

ناول میں مصنفہ نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ گدھ کی طرح مردار کھانے کا اثر انسان کی روحانی اور جسمانی صحت پر ضرور پڑتا ہے اور یہاں حرام کھانے سے مراد حرام کمائی کی نہیں بلکہ انسان کا ضمیر مردہ ہونا بھی ہے کہ جس کی وجہ سے انسان بے حسی کے جذبات کا شکار ہو کر دوسروں کے حق پر ڈاکے ڈالے۔ اس ناول میں قیوم راجہ گدھ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

انسان روشنیوں اور خوشبوؤں کی تحصیل میں دوڑتا چلا جاتا ہے اور پھر حقیقت کے پُراسرار سائے اور لکیریں معدوم ہو جاتی ہیں اور کچھ پانے کے چکر میں اس کا ضمیر مجرم بنتا ہے اور ہمیشہ کے لیے بے مرادی کے احساس میں دب جاتا ہے حالاں کہ گدھ بن کر سیمی اور امتل سے جسمانی لذت کو کشید کر لینے کے باوجود وہ ساری زندگی عشق لاحاصل کی کھوج میں رہا۔

مصنفہ قیام پاکستان اور موجودہ عہد کے تناظر میں پاکستانی طبقات کی مختلف صورتیں دیکھ کر حیران و پریشان ہیں کہ لوگ کس طرح اپنی خباثتوں کو مختلف رنگوں میں چھپا کر گرگٹ کو بھی پیچھے چھوڑتے ہیں۔ بانو قدسیہ کا مطالعہ بہت گہرائی اور گیرائی پر مبنی ہے یہی وجہ ہے کہ ناول کے متفرق موضوعات مختلف نتائج ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اقتباس جو ناول ”راجہ گدھ“ سے لیا گیا پیش نظر ہے:

> "ذرا سوچو کہ ساری صورتحال میں پاکستان کا امیر طبقہ ہجرت کرنے کے بعد سوسائٹی کے خلا کو کیسے پُر کر سکتا ہے۔ غیور قوم سے شاہی طبقے تک انگریزیت چھائی ہوئی ہے۔ پروفیسروں کو گریڈ کی خواہش ہے اور ڈاکٹروں کو باہر کے ملکوں میں سیٹل ہونے کی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی greed میراث میں ملی ہے۔ Conflict کا تضاد بھی حالات کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ (۵)"

ناول کا مذکورہ بالا حصہ ہمیں اس حقیقت سے روشناس کرواتا ہے کہ حرص و ہوس معاشرے کو زوال کی طرف دھکیل دیتی ہے اور ایسے حالات میں اعلیٰ آدرشی زندگی، بلند نصب العین اور مثالی اقتدار الغرض یہ کہ سبھی کچھ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور ایسا معاشرہ آنے والی نسلوں کو بھی صرف تضادات کی میراث عطا کرتا ہے۔ زوال پذیر معاشرے میں پرورش پانے والے حساس اور ذہین افراد خود کو

ذہنی و جسمانی شکست و ریخت سے نہیں بچا سکتے۔ سیمی، قیوم اور سہیل زمانہ حاضر کی ایسی ہی گم گشتہ روحیں ہیں۔ دراصل یہ وہ افراد ہیں جو اقدار سے کٹے ہوئے معاشرے سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ معاشرے کی سماجی و اخلاقی ابتری نے ان کے اندر دیوانے پن کے اسباب و آثار پیدا کیے اور دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی کے واقعات و سانحات نے کمزور اخلاقی کردار کے سبب ان میں کج روی اور فکری انتشار پیدا کر کے ان کی شخصیت کو مسخ کر دیا۔

پروفیسر سہیل کے کردار کے ذریعے مصنفہ نے ہمیں ہمارے معاشرے کے مردوں کی نفسیات کو بڑی خوبی سے بتایا ہے۔ یہ کردار ایک ذہین شخص اور ایسے استادوں کی کہانی بھی بیان کرتا ہے جو خود پر اتنا کنٹرول رکھتے ہیں کہ طالب علم ان کو دیوتا مانتے ہیں۔ اپنی باتوں کو منوانے کے گُر سے یہ خوب واقف ہیں۔ پروفیسر سہیل کے کردار کو پڑھتے ہوئے قاری اس حقیقت سے بھی روشناس ہوتا ہے کہ حسد کرنا صرف عورتوں کی فطرت میں شامل نہیں بلکہ مرد بھی اس فطرت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر سہیل میں حسد و رقابت کا جذبہ اس حد تک سرایت کیے ہوئے تھا کہ اس نے جانتے بوجھتے آفتاب اور سیمی کو ایک نہ ہونے دیا کیوں کہ وہ خود سیمی سے محبت کرتا تھا لیکن بہ حیثیت استاد اپنی محبت سے سیمی کو آگاہ نہ کر سکا اور سیمی اس کی تو نہ بن سکی لیکن اسے آفتاب کا بھی نہ ہونے دیا گیا۔

قیوم کے برعکس پروفیسر سہیل کا کردار فلسفیانہ نظریات کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیوم مغرب کا اور سہیل مشرق کا استعارہ ہیں۔ پروفیسر سہیل نہ صرف مغربی فلسفہ کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے بلکہ حلال و حرام سے متعلق اپنے نظریات بھی پیش کرتا ہے اور اس حرام کا تعلق حضرت آدم علیہ السلام کے شجر ممنوعہ کھانے سے جوڑتا ہے۔ اس کے نزدیک ہابیل و قابیل کے جھگڑے اور پھر قتل کی وجہ بھی وہ شجر ممنوعہ تھا جو آدم علیہ السلام نے کھایا اور وہ جینز رزق حرام کی صورت میں شامل ہو کر ان کے پاگل پن کی وجہ بنا اور یہی جینز آج بھی نسل در نسل افراد معاشرہ میں موجود ہیں۔ ناول ”راجہ گدھ“ میں عشق لاحاصل کے ساتھ ساتھ حرام سے جنم لینے والے انسانی انتشار، افراتفری اور بگاڑ کو پروفیسر سہیل کی تھیوری اس طرح سے پیش کرتی ہے:

> "مغرب کے ہاں حرام اور حلال کا تصور ناپید ہے اور میری تھیوری کے مطابق حرام رزق جسم میں داخل ہوتا تو وہ انسانی جینز کو متاثر کرتا ہے۔ نسل انسانی یہ جینز نسل در نسل منتقل کرتی ہے جس سے ایسی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ رزقِ حرام کمانے والے آئندہ نسلوں کو بھی اسی پاگل پن کا شکار کرتے ہیں جنھیں حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے۔"[٦]

اس ناول میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی ذہنی، جذباتی، معاشرتی اور اخلاقی حیثیت و کیفیات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے کے ان طبقات میں پیدا ہونے والے معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی بحران کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

سیمی شاہ اور آفتاب کی صورت میں اگر بیورو کریٹس اور تجارتی افراد کی نمائندگی ہوئی تو وہیں قیوم کے دیہاتی پس منظر کے توسط سے اس کی نفسیاتی، معاشرتی اور دیگر الجھنوں اور مشکلات کو آشکارہ کیا گیا ہے۔ قیوم ایسے کردار کا نام ہے جو ہمارے معاشرے کی بے راہ روی کے شکار نوجوان طبقے کی عکاسی بھی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں بانو قدسیہ نے اسے راجہ گدھ کا استعارہ بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا شخص ہے جو مردہ آرزو پر پلتا ہے اور زندہ لاشوں کے ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ سیمی کے متعلق سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے ساتھ ایسا جسمانی تعلق استوار کرتا ہے جو ایک گدھ کا مردار کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر اس کی موت کے بعد عابدہ اور امتل کے ساتھ جو تعلق بنائے وہ بھی زندہ لاشوں کے ساتھ مردار رشتے ثابت ہوئے۔ قیوم کا کردار دراصل اخلاقی، دیوالیہ پن اور روحانی بنجر پن کی علامت ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ جن حالات و مسائل سے دوچار اور نبرد آزما ہے وہ کہیں بھی با کردار اور مضبوط قوتِ ارادی کا انسان نظر نہیں آتا۔

قیوم اس تبدیلی کو محسوس تو کرتا ہے لیکن اس کی طرف لوٹ کر واپس جانا اب اس کے لئے ممکن نہیں رہا۔ راجہ گدھ میں مصنفہ نے صرف شہری زندگی کی ناامیدی، بے بسی اور ان سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیوں کا ہی پردہ چاک نہیں کیا بلکہ دیہی زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے چندرا گاؤں کو روایتی معاشرے کی علامت اور ماں کو اس معاشرے کی اخلاقی و معاشرتی روایات کا استعارہ بنایا ہے کہ جس کے مرتے ہی گھر اور گاؤں کو کلر چاٹ گیا۔ ناول ''راجہ گدھ''میں اس ویرانی کو کچھ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

> " یہ وہ چندرا نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا۔ تب تو ہرے کھیتوں میں تانگہ آتا جاتا ہوا بھی نظر نہ آتا تھا۔ تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ ماں زندہ تھی تو چندرہ گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔ ہرے بھرے درختوں میں کھیت تھے اور میٹھا پانی تھا۔ ہر کسان کے گھر میں اناج تھا۔ اب ہر جگہ کلر اور شور زدہ زمین ہے ۔ موت ہی موت ہے۔ اور ماں بھی نہیں کہ آنگن آباد رہتا۔"[۷]

ناول میں بانو قدسیہ نے یہ نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ رزق حرام کی وجہ سے افراد انفرادی سطح پر اور معاشرہ اجتماعی سطح پر اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زوال کا شکار ہوتا ہے۔ فرد اور معاشرہ میں جب حلال اور حرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے تو منفی اثرات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جب انفرادی سطح پر فرد اور اجتماعی سطح پر معاشرہ رزق حرام کی طرف مائل ہوتا ہے تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آنے لگتا ہے جو بظاہر ترقی یافتہ نظر آتا ہے لیکن اندر سے کھوکھلا، تضادات سے بھرپور اور فرسودہ معاشرتی اقدار سے چمٹا ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے کا مجموعی تصور اخلاق پست ہو جاتا ہے، مذہب صرف ظاہری عبادات کی ادائیگی تک محدود رہ جاتا ہے جب کہ اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدریں رسم و رواج اور روایات میں کھو جاتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں مذہبی لبادے کے اندر اخلاقی پستی کو بانو قدسیہ نے عابدہ کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے جو ایک پاکٹ سائز بہشتی زیور ہے اور مذہب کو اپنی خاص قسم کی پریکٹیکل عقل کے مطابق استعمال کرتی ہے۔

عابدہ ایک سیدھی سادھی نیم جاہل عورت تھی جس کی مذہبی اور دنیاوی تعلیم اوسط درجے کی تھی۔اس کی ذہنی اور اخلاقی تربیت سطحی مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی۔اس کے امر اور نہی بالکل فکس تھے۔نیکی اور بدی کا تصور اس کے ذہن کے الگ الگ خانوں میں بند تھا۔اس کا شعور اتنا پختہ اور حساس نہیں تھا کہ احساس گناہ سے اس کے اندر ذہنی تصادم برپا ہو جاتا۔بانو قدسیہ نے اس کردار کے ذریعے سے خواہشوں اور آرزوؤں کے جنگل میں بھٹکنے والے افراد کی ذہنی ونفسیاتی حالت کا المیہ بیان کیا ہے۔یہ وہ افراد ہیں جو مثبت جذبوں سے اپنی روح کو سکون و قرار دینے کی بجائے حسد، نفرت اور ایسے ہی منفی جذبوں کی پرورش کر کے ہمیشہ ہی نا آسودہ رہتے ہیں۔عابدہ کے ذہن میں ہمیشہ منفی خیالات اور دل میں منفی جذبوں کی بھرمار رہی ہے جو درحقیقت روح اور جسم دونوں کے حرام کھانے کی سزاوار ہے۔

اسی طرح ماسی الفت اور عزیز گاتن کے ضمنی کرداروں کے ذریعے معاشرے کے پست تصور اخلاق،طبقاتی امتیاز اور متضاد و منافقانہ مذہبی اقدار پر کڑی تنقید کی ہے۔مصنفہ کہتی ہیں کہ جب کوئی معاشرہ تنزلی کی طرف آنے لگتا ہے تو اس کے اندر حقوق کی جنگ چھڑ جاتی ہے اور جس قدر حقوق کا مطالبہ زور پکڑ تا ہے اسی قدر محبت کی قدر ختم ہو جاتی ہے۔مزید بر آں یہ کہ جس معاشرے میں محبت ختم اور حقوق کی مانگ بڑھ جائے تو وہاں مفاد پرستی کا دور دورہ ہو جاتا ہے اور معاشرہ جنگ کا میدان بن جاتا ہے۔

ناول میں زوال پذیر شہری زندگی کا ایک رخ بھی دکھایا گیا ہے جہاں مادیت پرستی نے مذہب اور اخلاقیات کی اصل شکل بگاڑ رکھی ہے اسی وجہ سے ایسے معاشرے میں فکر و عمل دونوں ہی خالص نہیں ہیں۔ایسے معاشرے میں پلنے والے افراد ذہنی کشمکش اور تضادات کا شکار رہتے ہیں۔اس طرح کے معاشرے میں زندگی گزارنے والے افراد کی دو اقسام ہیں ایک وہ جو اپنی معاشرتی روایات سے انحراف کرتے ہوئے قدروں سے کٹے معاشرے کو قبول کر کے خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتے ہیں جب کہ دوسری قسم ان افراد کی ہے جن کی حساس طبیعت بنجر معاشرے کا آلہ کار بننے میں مزاحمت کرتی ہے۔اقدار و روایات سے عاری معاشرے سے سمجھوتہ کرنے والے افراد کی زندگی بظاہر پرسکون نظر آتی ہے لیکن یہ بے روح اور احساس و جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ایسے معاشرے کے لوگ مشینی زندگی اور معمولات کے عادی ہوتے ہیں۔یہ لوگ انسانی رشتوں کی گندھی محبت و شدت کو محسوس کئے بنا کٹھ پتلیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ناول میں ایسے لوگوں کی مثال بھائی مختار اور بھابھی صولت جیسے کرداروں کے ذریعے سے دی گئی ہے۔اس حوالے سے ناول "راجہ گدھ" کا یہ حصہ دیکھئے کہ جس میں قیوم اپنے بھائی مختار کے حوالے سے اپنے خیالات بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے:

> "بھائی مختار کی ساری منزلیں مادی تھیں۔وہ ساندھے سے گلبرگ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ان کے سامنے بچوں کی اعلی تعلیم کا گول تھا۔مختار بھائی تفریح کے وقت ٹرانسسٹر سنتے جس طرح کا سٹیم جیولری سے عورت میں کچھ ٹین پین کچھ سنتھیٹک فائبر شامل ہو جاتا ہے اسی طرح زیادہ ریڈیو سننے والوں کے نقطہ نظر بڑے عقلی،مادی، جمہوریت پسند ہو جاتے ہیں وہ

ریڈیو پر ہونے والے مباحثوں سے مسائل سن کر باتیں کرتے ہیں۔ان کی زندگی سے چاند کا
سفر ختم ہو جاتا ہے صرف چیونٹیوں کی منزلیں باقی رہ جاتی ہیں۔" (۸)

ناول راجہ گدھ میں جو مادہ پرست معاشرہ بیان کیا گیا ہے اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اسی وجہ سے قیوم کا اپنے گھر والوں کے ساتھ جو تھوڑا بہت رشتہ باقی ہے وہ انتہائی کھوکھلا اور میکانکی انداز لیے ہوئے ہے۔دراصل بانو قدسیہ ناول کے ان کرداروں کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ آجکل جو ہمارا موجودہ معاشرہ ہے جسے ہم جدید اور ترقی یافتہ معاشرہ کہتے ہیں اس میں بسنے والے افراد تنہائی ، آدم بیزاری اور مردنی کے آزار میں مبتلا ہوتے ہیں اور جب رشتوں کا تقدس ختم ہو جائے اور وہ محبت و احترام جیسے جذبات سے آری ہو جائیں تو پھر ایسے معاشروں میں شکستہ خاندانوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔

مصنفہ نے اس ناول میں دیگر کہانیوں اور موضوعات کے ساتھ طوائفوں کے حالات زندگی، ان کے احساس و جذبات اور سوچ و افکار کو بھی جگہ دی ہے۔اس کے علاوہ مصنفہ نے ان کے رہن سہن اور اقسام زندگی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔امتل ناول میں ایک عمر رسیدہ طوائف کے کردار میں دکھائی گئی ہے جو جوانی میں ریڈیو اسٹیشن پر گایا کرتی تھی لیکن وقت گزرنے اور عمر ڈھلنے کی وجہ سے نہ صرف اس کے حسن اور آواز کی چکا چوند ماند پڑی بلکہ اس کی مانگ بھی ختم ہوئی۔

امتل دراصل مجموعہ اضداد تھی اس نے زندگی کو اور زندگی نے اسے خوب استعمال کیا تھا۔وہ چالیس سالہ زندگی میں صدیوں کا تجربہ حاصل کر چکی تھی اور زندگی کے ہر روپ کو دیکھ چکی تھی اس لیے کبھی وہ پانچ سال کے بچے کی طرح معصوم لگتی تو کبھی بوڑھی نائکہ کی طرح تجربہ کار خرانٹ اور بے حس بن جاتی تھی۔دراصل وہ جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر کئی طرح کی کج رویوں کا شکار تھی۔ناول ”راجہ گدھ“ میں اس کی شخصیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"وہ بچوں کی طرح کسی Sustained Emotion کے لائق نہ رہا تھا۔اس کا لڑائی جھگڑا پیار
اور محبت سبھی موڈ کے تابع ہو گئے تھے۔کسی تھیوری اور مسلک کے دباؤ میں وہ کچھ بھی کر
سکتی تھی۔وہ بغیر سوچے اور پرکھے کر جاتی تھی۔جی چاہا تو مدد کر دی اور نہ چاہا تو گالی دے
سی۔اس کا مدد کرنے کا بھی اپنا ہی فلسفہ تھا اور یہ سارا نظام Impulse پر چلتا تھا کہ اس کی
دوستی، دشمنی کبھی منٹوں اور کبھی برسوں پر محیط ہوتی تھی۔"(۹)

امتل ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح ہے جو اپنے لئے ایک نقطہ استقرار کی تلاش میں رہتی ہے۔اس کی ہستی اس پورے نظام اور بندھن پر روشنی ڈالتی ہے جس میں بدنصیب طوائفیں اپنی زندگی کسی نہ کسی طرح گزارنے کے لیے اُس میں ملوث رہتی ہیں۔اپنی وراثتی مجبوریوں کے باوجود امتل ایک ایسے گم کردہ راہ کے مسافر کی طرح ہے جس کے دل میں اپنی منزل تک پہنچنے کی آس بہر حال باقی رہتی ہے اور اس کے لیے سہارا بنی رہتی ہے۔امتل کسی واضح سوچ، فلسفے اور فکر کی پابند نہ تھی کیوں کہ وہ جس پس منظر سے ابھر کر سامنے آئی ہے

اس کی بنیاد بھی کسب حرام پر رہی ہے۔ امتل کی زندگی پر نگاہ دوڑائیں تو لاحاصل کی آرزو میں اس نے کئی دشت و صحرا چھانے۔ محبت کے تعاقب میں وہ گھر سے نکلی اور عزت کی خاطر اس نے شادی کی لیکن دونوں دفعہ آبلہ پائی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

زندگی کی تلخیوں اور رنگارنگ تجربات نے اسے شعور کی پختگی تو عطا کی لیکن جذباتی طور پر وہ ٹوٹ پھوٹ اور ابتری کا شکار رہی ۔سیمی کے بعد امتل کے کردار میں ہمیں ارتقا نظر آتا ہے۔ جیسے سیمی عشق لاحاصل، قلب ماہیت کرنے والا عمل ثابت ہوا تھا اسی طرح محبت کی لاحاصل جستجو نے امتل کو طوائف کی ہوس پرستی سے قلندرانہ بے نیازی کے راستے پر ڈال دیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امتل کے سابقہ گناہوں اور اخلاقی وجسمانی بے راہ روی کا بوجھ اتنا بھاری ہے کہ ان کے ساتھ وہ لطیف روحانی سفر پر روانہ نہیں ہو سکتی۔ امتل نمائندہ کردار نہ ہونے کے باوجود انفرادی شان رکھتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے بانو قدسیہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ایک طوائف اگر اپنے گناہ سے شعوری طور پر توبہ کرکے گناہ کے ماحول سے نکلنا بھی چاہیے تو معاشرہ اسے سچے دل سے قبول نہیں کرتا۔

مصنفہ معاشرے کی تنگ نظری اور فرسودہ اخلاقیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن دوسری طرف بانو قدسیہ اس حقیقت کو بھی آشکارہ کرتی ہیں کے طوائف جس عیش و عشرت اور آسائشوں کی عادی ہو جاتی ہے لاشعوری طور پر وہ انہیں نہیں چھوڑ سکتی یہی وجہ ہے کہ عام گھریلو زندگی میں جب اسے آسائشیں نہیں ملتیں تو وہ دوبارہ گناہوں کی دلدل سے بھرپور زندگی کی طرف منہ موڑ لیتی ہے۔ دراصل بانو قدسیہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو جب ایک دفعہ حرام کھانے کا چسکا لگ جائے تو پھر اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ناممکن ہے۔

مردار خور فطرت کو توبہ کے لئے جس کڑی آزمائش کے راستے پر چلنا پڑتا ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ناول راجہ گدھ میں مصنفہ نے عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی اور اس کے وجود کی ناقدری پر بھی آواز اٹھائی ہے بالخصوص ہمارے معاشرے میں یہ پرچار تو کیا جاتا ہے کہ عورت آزاد ہے لیکن در حقیقت اسے کوئی آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں عورت کے جذبات کا احساس کرنے کے بجائے ان جذبات کا خون کیا جاتا ہے اور یوں عورت اس منافقانہ اور دوغلے معاشرتی ڈھانچے کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر مسلسل جبر و تشدد کی زد میں رہتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی عورت کو بچپن سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ مرد چاہے وہ باپ، بھائی، خاوند کسی بھی روپ میں اس کے ساتھ کوئی بھی زیادتی کرے وہ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتی رہے چنانچہ عورت اپنی گھٹی میں پڑھنے والی تربیت کو مد نظر رکھتے ہوئے کبھی بھی اپنے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کے خلاف نعرہ حق بلند نہیں کرتی اور ہمیشہ مرد کے استحصال کا شکار رہتی ہے۔

> "ویسے بھی مرد کا عورت سے بھوک کا بڑا پرانا تعلق ہے کہ کوئی مرد عورت کے عشق میں جذباتی حد تک بھوکا ہوتا ہے اور بھوک مٹانے کی فکر میں رہتا ہے۔ ذہنی بھوک ہی شکل ہی خلا کو جنم دیتی ہے جو تفریح کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ جسمانی بھوک بچوں کی طرح چھوٹی چھوٹی اشتہائیں ختم کر سکتی ہے لیکن اس سے زندگی صرف ہوتی ہے بھوک نہیں۔"[۱۰]

انسان ازل سے متلاشی ہے اور ابد تک یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کس چیز کی تلاش میں ہے تو اس کا جواب یقیناً یہ ہے کہ وہ روح اور جسم کے سکون اور ذہن و قلب کی شادمانی کا متلاشی ہے یعنی انسان کی ساری زندگی کی تگ و دو اسی مقصد کے لئے ہے اور یہ ساری چیزیں انسان خالص محبت سے ہی پا سکتا ہے۔

ناول کے آخری حصہ بعنوان موت کی آگاہی میں بانو قدسیہ کے تمام تر خیالات کا ایک نچوڑ یہ بھی ہے کہ یہاں یعنی اس دنیا فانی میں کسی کو بھی ابدیت حاصل نہیں ہو سکتی اور یونہی لوگوں میں جسمانی لذتوں اور اکتسابی لغزشوں کے جراثیم بڑھ کر ان کی جان ہی ہڑپ کر لیتے ہیں۔ نادانی و بے وقوفی کا یہ پیمانہ برسوں سے خالی ہے اور ہمیشہ یوں ہی خالی و فانی رہے گا لیکن انسان پھر بھی اس فانی زندگی میں اپنے مشاغل جاری رکھے ہوئے کبھی بھی نہیں اکتائے گا۔ انسان کیا ہے، کیا تھا اور کس جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے ؟اس کی اصل حالت کیا ہوتی ہے وہ کس جانب گامزن سفر رہتا ہے۔ موت کی حقیقت ہمیشہ ہی فکر انسانی کے لیے ایک پیچیدہ سوال کی طرح رہی ہے جو کبھی بھی حل نہ ہو سکا موت کی آگاہی انسان کو ہراساں کر کے اس کی روح کو بے چین و مضطرب کر دیتی ہے۔ ناول میں بانو قدسیہ نے قیوم کو موت کی آگاہی کے آزار میں گھلتے ہوئے دیکھایا ہے کیوں کہ سیمی اور امتل کے مر جانے کے بعد موت اس کے لیے ایک بہت بڑی حقیقت بن چکی تھی لیکن وہ اس کی اصلیت سے آگاہ نہ تھا۔ وہ شب و روز اس فکر میں گھلنے لگا۔

موت کے اسرار و رموز جاننے کی سعی میں اس کی فکر لامتناہی سوالوں کے بھنور میں چکر کھانے لگی اور انتہائی پریشان خیالی نے اس کی ذات کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ ناول کے آخری حصہ میں قیوم اور پروفیسر سہیل اکثر ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں ان کی ملاقات ایک سائیں سے ہوتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ جس سے بہت سی گفتگو کرنے اور بے شمار چیزیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دونوں یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ انسان جو زندگی میں اتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں فلسفیانہ باتیں اور مشکل تعبیرات کرتے ہیں اور صرف خود اپنی ذات کے لئے جیتے ہیں تو یہ سب کیا ہے اور ان سب کی حقیقت کیا ہے اور انسان کیوں بے چین جسموں اور غیر مطمئن روحوں کے ساتھ صبح و شام بسر کرتے ہیں۔

خود کو معتبر اور دوسروں کو حقیر جاننے کا فلسفہ کس حد تک درست ہے اور وہ کیا شہ ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے ہم ہر حد سے گزرتے ہوئے بالآخر رسوائی کے گہرے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ جس سائیں سے یہ ملاقات کرتے ہیں وہ انہیں ایک قبر تک لے جاتا ہے۔ ناول ”راجہ گدھ “میں اس منظر کی یوں عکاسی کی گئی ہے:

> "یہ ہماری قبر ہے یہاں ہر رات ہم قرآن کریم کی تلاوت کرنے کے لیے آتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔ آپ کے پیر و مرشد بھی یہاں آتے ہیں ؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ان کے وصال کو چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن یہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ ہمیں ہدایت دینے آتے ہیں۔ [۱۱]

ناول کے اواخر میں بانو قدسیہ نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا جو ان کے نظریہ کے مطابق دیوانگی کی مثبت سمت کا حامل ہے۔ ان کے خیال میں یہ وہ دیوانگی ہے جو نہ عشق لاحاصل سے پیدا ہوتی ہے نہ لامتناہی تجسس سے اور نہ موت کی آگاہی سے بلکہ یہ دوسری قسم کی دیوانگی ہے جس کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ مصنفہ اسے مقدس دیوانگی کا نام دیتی ہے جو ایک خاص قسم کے طیب رزق سے پیدا ہوتی ہے جو بندے کو خدا کی طرف سے براہ راست حاصل ہوتا ہے۔ آفتاب کا بیٹا افراہیم جو دس سال کا بچہ ہے مقدس دیوانے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کی دیوانگی کو سمجھنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔

بانو قدسیہ نے دیوانگی کو عرفان کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ افراہیم اسی قسم کے دیوانے پن کی ایک مثال ہے جو دماغی اور جسمانی طور پر بہت کمزور ہے لیکن اسے گنبد نما مدینہ کی گلیاں اور روس، امریکہ، افریقہ کے کلیساؤں میں اذانیں سنائی دیتی ہیں۔ اس بچے کی حالت ایسی ہے کہ وہ رب کا نام پکارتے ہی سجدوں میں گر جاتا ہے۔ کبھی وہ عبرانی تو کبھی عربی زبان بولنے لگتا ہے۔ ناول کے آخری چند صفحات پڑھنے کے دوران وہ لوگ بھی عیاں ہوئے جو زندگی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور آخر کار تھک ہار کر اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو واقعی حیات کو پا جانے کے باوجود ناپائیداری اور نیستی کا احساس انہیں وہ سرمایہ فراہم نہیں کرتا جسے حیات جاوداں کہتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ کا اختتام بہت عجیب منظر پر کیا ہے جس کا اندازہ ناول ''راجہ گدھ'' کے اس اختتامی حصے کو پڑھنے کے بعد بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> "افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سرنگوں تھا۔ میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل سیڑھی پر متمکن کھڑا تھا اور ہم دونوں کے ارتقائے انسان کا مسئلہ کھنچی کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ انسان کو ابنارمل سے سوپر نارمل کے درجے پر پہنچنے کے لیے اسی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔"[۱۲]

مختصر یہ کہ قیام پاکستان کے بعد لکھے گئے ناولوں میں بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ بہت سے حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح مختلف علوم و فنون اور دانش و بینش سے مربوط معنویت اس ناول میں زیر بحث ہے وہ یقیناً بانو قدسیہ کا ہی خاصہ ہے یہی وجہ ہے کہ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے یہ ناول عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء)، ص۔ ۷۸

۲۔ ایضاً، ص۔ ۱۰

۳۔ ایضاً، ص۔ ۱۲

۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲

۵۔ ایضاً، ص۔ ۱۷، ۱۸

۶۔ ایضاً، ص۔ ۵۷

۷۔ ایضاً، ص۔ ۳۴۴

۸۔ ایضاً، ص۔۱۷۹

۹۔ ایضاً، ص۔۱۵۸

۱۰۔ ایضاً، ص۔۴۰۹

۱۱۔ ایضاً، ص۔۵۶۱